نخلِ جنوں



علیم اللہ حالی

سرِ شاخِ تعلق جل چکا ہے
مگر نخلِ جنوں شاداب اب بھی

یہ کتاب بہار اُردو اکادمی کے جزوی مالی تعاون سے شائع ہوئی

NAKHL-E-JUNOON (Poetry)

BY ALIMULLAH HALI   40/=

نخلِ جنوں

(نظمیں، غزلیں)

علیم اللہ حالی



پوسٹ بکس نمبر ۵۴ ۲۶
نیروبی (کینیا)

© علیم اللہ حالی
یونیورسٹی پروفیسر، شعبۂ اردو،
مگدھ یونیورسٹی، بودھ گیا ۸۲۴۲۳۴

پہلی بار ۔ اکتوبر ۱۹۸۹ء
تعداد ۔ ۱۰
قیمت ۔ چالیس روپے
کتابت ۔ تنویر احمد
سرورق ۔ رزاق ارشد
طباعت ۔ اے ون آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی ۲

زیر اہتمام
پریم گوپال متل

باختیار تقسیم کار

موڈرن پبلشنگ ہاؤس
۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

انتساب

اپنی عزیز بھابی

قمر رحمان

کے نام

— جو مجھے سب سے زیادہ پہچانتی ہے

— علیم اللہ حالی

ترتیب



کوکن اردو رائٹرز گلڈ (شاخ نیروبی) کینیا (مشرقی افریقہ)

تعارف

"نیم شگفتہ" "وقت کا سورج" اور "صحرا کی دھوپ" کے خالق اور مشرقی افریقہ میں مقیم کوکن کے بے لوث اور مخلص خدمت گار اور شاعر جناب ساحر شیوی کی تحریک اور ذاتی مالی تعاون سے ۱۹۶۸ء میں کوکن اردو رائٹرز گلڈ کا قیام عمل میں آیا گلڈ کے بنیادی اور ترجیحی مقاصد میں کوکن کے اردو ادبا و شعرا کی ہمت افزائی اور ان کی ادبی خدمات کو اردو دنیا سے متعارف کرانا تھا ۱۹۷ ء میں اس پروگرام کے تحت ادارے نے داؤد غازی مرحوم کا شعری مجموعہ "دشت کی صدا" زیور طبع سے آراستہ کرایا، لیکن افسوس یہ ادارہ زیادہ دن سرگرم نہیں رہ سکا کچھ احباب کی بے نیازی اور آپسی کشمکش کے باعث اس پر جمود طاری ہوگیا اور کوئی دوسری کتاب منظر عام پر نہ آسکی۔ لیکن ساحر شیوی نے ہمت نہیں ہاری، اور اس میں پیدا شدہ تعطل کو ختم کرنے کے لیے وہ ہر وقت مصروف اور منہمک رہے بالآخر موصوف کی کوششیں بارآور ہوئیں اور ۱۹۸ ء میں کینیا (مشرقی افریقہ) کی راجدھانی نیروبی میں از سرِ نو ادارے کو مستحکم بنیادوں پر قائم کیا گیا یہاں ساحر کو مقامی ادب نواز دوستوں اور کرم فرماؤں کا بھرپور تعاون حاصل ہوا اور نئے ولولے اور جوش کے ساتھ پروگرام کی ابتدا ہوئی۔ ادارے کی تنظیمِ نو کے بعد مندرجہ ذیل کتابیں زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آچکی ہیں جن کی اردو دنیا میں خاطر خواہ پذیرائی ہوئی ہے

● شعاعِ اول: مہر رودولوی مرحوم (۱۹۸۱ء) ● مہاراشٹر کی تہذیبی و ادبی قدریں: بدیع الزماں خاور (۱۹۸۲ء) ● لہو کے چراغ: انجم عباسی (۱۹۸۳ء) ● چہرے: شاکر کاکوی

(۱۹۸۴ء) ● لمحے لمحے کا کرب، پرویز راہی (۱۹۸۵ء) ● مرآۃ المعروف، عارف سیمابی سالکوٹی
(۱۹۸۵ء) ● نئی تحریریں، ڈاکٹر عبدالستار دلوی (۱۹۸۶ء) ● کوکن کے سپوت ــــ احمد عباسی/
شیخ اسماعیل (۱۹۸۶ء) ● ڈھلتا سورج، شیخ اسماعیل (۱۹۸۷ء) ● اُردو کہاوتیں اور
ان کے سماجی لسانی پہلو، ڈاکٹر یونس اگاسکر (۱۹۸۸ء) ● کہتا ہوں سچ، شرف کمالی
(۱۹۸۸ء) ● پیرواہ، رشیدہ قاضی (۱۹۸۸ء) ● خلیل کا مکان، آدم نصرت (۱۹۸۸ء)
● شام و سحر، معل اقبال اختر (۱۹۸۸ء) ● گردش ہمارا دکس، مرتبہ، احمد عباسی (۱۹۸۹ء)
● محل محبوب، ڈاکٹر علیم اللہ حالی (۱۹۸۹ء) ● کوکن کے افسانے: (زیر طبع) (۱۹۸۹ء)
● کوکن کے سپوت (حصہ دوم) احمد عباسی/شیخ اسماعیل (۱۹۸۹ء) ــــــــــــ ان میں
سے اوّل الذکر دو کتابیں نقش کوکن پبلیکیشنز اور بقیہ موڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی کے
زیرِ اہتمام شائع ہوئی ہیں علاوہ ازیں جناب عباس میاں کردیکر کی نصیحت آموز کہانیاں
"صدف صدف موتی" ہمی گلڈ کی بیرونی شاخ کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے

ــــــــــــ شیخ اسماعیل
سکریٹری

اپنی باتیں

سفر جلے دنوں کا' میرا پہلا شعری مجموعہ تھا' یہ محلِ حروف دوسرا مجموعہ ہے ـــــ مگر اس سے کیا ہوتا ہے' پہلا' دوسرا' تیسرا ـــــ یہ موضوعات کی کوئی حد ہے نہ بابِ گفتار میں کمی ہے لیکن میرے نزدیک سوالِ لطیفہ خصوصاً شاعری کی مقصدیت کا سوال اٹھتا ہے' آخر ان موضوعات کو کیوں نہ کیا جائے' آخر گفتار میں انفرادی دلکشی کے لیے ہاتھ پیر کیوں مارے جائیں ـــــ دراصل شاعری کا سارا معاملہ ذاتی ہوتا ہے' انفرادی ہوتا ہے' اس میں تکلف کی کوئی بات نہیں ہے کہ ہم یہ کہیں کہ میں اپنے لیے شاعری کرتا ہوں یہ ایک انتہا درانہ بات ہے اس بات سے بعض حضرات بد اکثر پڑھنے والے یا تو شاعر کو غلط سمجھتے ہیں یا ان پر جبر کر الجھا جاتے ہیں

سچ بات یہ ہے کہ شعر و شخص سے بڑھ کر ذاتی ذہنی (PERSONAL) شے اور کیا ہو سکتی ہے ؟ اگر موضوعات خارجی واقعات اور تعلقات سے پیدا ہوتے ہیں (اور زیادہ سلسلہ بہت حد تک صحیح ہے) تو پھر شاعر کو انفرادیت مجھے الجھ کر کیا ہوتی ہے کم سے کم یہ تو طے ہے کہ موضوعات نہیں ہوتے خارجی واردات شاعر کے لیے محرک کا کام

کرتے ہیں اور یہ تمام شعرا کے لیے یکساں ہیں رہا مسئلہ الفاظ اور ان کے دو یہ تو
استعمال کا تو یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ ہم سب ایک ہی طرح کے اور کم و بیش
ایک ہی طرح سے الفاظ کا استعمال کرتے ہیں کوئی آسمان سے الفاظ اُتار کر نہیں لاتا' ہاں یہ
ایسا ہے کہ کہیں کہیں وہ الفاظ کو مروّجہ مفاہیم سے ہٹ کر نئی معنوی وسعت دیے دیتا ہے
یہ معنوی توسیع ہر کس کہیں کہیں ہی نظر آتی ہے۔ گویا شعری اظہار کے تمام وسیلے معروضی
ہوتے ہیں یہ سبھوں میں یکساں' مساوی اور مشترک ہیں' یہ بھی طے ہے کہ ان خارجی
اور معروضی وسائل کو شعری تخلیق کا درجہ نہیں دیا جا سکتا ان جو چیز شاعر کی
کُلیۃً اپنی ہوتی ہے وہ حالات و واقعات کا ردِّ عمل' محسوسات' جذبات و کیفیات اور
رنج و راحت میں اظہار کی انفرادیت ہے شاعر محسوسات کے طوفانِ یم بہ یم کو الفاظ
کی دیواروں میں مقیّد کرنا چاہتا ہے' یہ ایک مشکل کام ہے اور بسا اوقات خطرناک
بھی' بالکل جیسے 'آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے' والی بات کہی ہے ——
اور اکثر یہ ہوتا ہے کہ جذبات و محسوسات کی یورش الفاظ کے کمزور کناروں کو
توڑ کر باہر بہنے لگتی ہے' یہی وہ مقام ہے جہاں محسوسات کی شدت کے باوجود شعری
تخلیق ناکام ہو جاتی ہے

خود اپنے لیے اپنے آپ کا اظہار ایک زبردست مجاہدۂ نفس ہے اگر شاعری
دوسروں کے لیے ہو تو پھر تخلیقی عمل میں کوئی پیچیدگی نہیں رہتی' یہاں کام
صرف بیانیہ سے نکل جاتا ہے مگر بیانیہ کبھی اعلیٰ شاعری کا درجہ حاصل
نہیں کر سکتا

شاعری اپنے لیے ہوتی ہے کا مطلب ہرگز نہیں ہو تاکہ کسی شاعر کا کلام
دوسروں کے لیے شجرِ ممنوعہ ہو جائے بلکہ اس کا مدّعا یہ ہے کہ شاعر
اپنے مئیں اور اپنے احساس و اظہار کے تئیں مخلص ہو' وہ باہر کے ماری سے نہ
مرعوب و متاثر ہو اور نہ بیزاری محسوس کرے باہر کے ماری سے نے ساری
مکارم میں اعتماد و اخلاص پیدا کرتی ہے دوسرا کیا چاہتا ہے؟ دوسرے کی

پسند و ناپسند کیا ہے؟ یہ سوالات اگر فنکار کے ذہن پر طاری ہو جائیں تو وہ اچھی شاعری تو کیا ایسا اور خراب شاعری بھی نہیں کر سکتا

میرا شعری مزاج انہی عوامل سے متشکل ہوتا ہے۔ میری شاعری میں میرا رویہ سخن خود میری طرف ہے جب آدمی اپنے آپ سے ہم کلام ہوتا ہے تو اظہار و بیان کے وہ اصول و قواعد کام نہیں آتے جو دوسروں تک اپنے مافی الضمیر کو پہنچانے کے لیے ہوتے ہیں یہاں ایک طرح کے MONOLOGUE کی صورت ہوتی ہے ——— اور ایسا اوقات اظہار کا یہ طریقہ پیچیدہ، ٹیڑھا میڑھا مبہم اور کبھی کبھی ناقابل فہم ہو جاتا ہے مجھے اعتراف ہے کہ میرے شعری اظہار میں یہ عجوبہ کاریاں موجود ہیں، میں اس کے لیے معذرت خواہ ہوں نہ شرمسار ایسا ہے کہ میرے ہاں کو میری ہی سخت ضرورت سے درست ہو جانا چاہیے۔ آہستہ چلنے والی گاڑی کو اگر کہنے والے سے درست اگر پہنچا جائے تو بات سنی بھی جا سکتی ہے اور سمجھی بھی جا سکتی ہے

شاعری بلاشبہ ایک شعوری عمل ہے، کم از کم اظہار کی سطح پر اس کا شعوری ہونا مانا جا سکتا ہے مگر ہمیں یہ نہیں بھول جانا چاہیے کہ شعور، تحت شعور اور لاشعور کی سطحیں بدلتی رہتی ہیں انسانی ذہن میں سوچ کا عمل بڑا الجھا ہے تحت شعور اور لاشعور یہ باریک خطوط کے ذریعے آپس میں الگ ہوتے ہیں یہ خطوط مبہم بھی ہیں اور عارضی بھی اس لیے اکثر و بیشتر ایک دوسرے کی حدوں میں ملی ہوتی ہیں۔ اس لیے یہ ٹھوس اصطلاحیں غیر واضح، غیر متعین اور متحرک کیفیتوں کے لیے محض نظری علامت ہی استعمال کی جا سکتی ہیں اسی لیے یہ ماننا ہوگا کہ شاعری بنیادی طور پر ایک شعوری عمل ہے ہمیں یہ بھی سمجھنا ہوگا کہ یہ اکثر و بیشتر غیر ارادی حد تک سے اپنا سفر شروع کرتی ہے، اظہار و بیان کی منزل میں آتے آتے اس کی بے اختیاری اور غیر ارادیت رفتہ رفتہ ختم ہوتی جاتی ہے ——— اور بعض یہ مکمل شعور کی حکمرانی میں آجاتی ہے شعور، تحت شعور اور لاشعور کی اس رسہ کشی میں بعض ایسی نمونے بھی کیفیات کے مرکز سے دور بھی ہو جاتے ہیں آپ کو میرے اس مجموعہ کلام میں ایسے نمونے بھی مل

جائیں گے

جدید و قدیم کے بارے میں میرا تصور یہ ہے کہ اچھی شاعری ہمیشہ جدید ہوتی ہے جب تک کوئی شاعر اپنے ماقبل کے فنی معیار و اقدار سے آگے بڑھ کر نئے خیالات و لب و لہجہ نہیں اپنانا اس وقت تک اس کے کلام میں دلکشی، جاذبیت اور انفرادیت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اردو شاعری کی تاریخ گواہ ہے کہ غزل کے قدیم لب و لہجہ میں شاعری کرنے والے بے شمار شعرا گلدستۂ طاقِ نسیاں ہو گئے۔ ان کا ذکر بس کہیں کہیں اردو تذکروں میں محدود ہو کر رہ گیا اس کی بنیادی وجہ یہ کہ ان شعرا نے نئی راہیں نہیں نکالیں، بزرگوں کی راہوں پر چلنا ہی انھوں نے سعادت مندی سمجھی لیکن سچی اور اچھی شاعری کو سعادت مندی اور اتباعِ بزرگاں سے کچھ زیادہ واسطہ نہیں ہے یہاں تو عالم یہ ہے کہ

ہر کس کہ شد صاحب نظر دینِ بزرگاں خوش نہ کرد

پوری اردو شاعری کی مرتب تاریخ دیکھ جائیے میر، غالب، ذوق، داغ، آتش، ناسخ، اصغر، فراق، فیض، جمیل مظہری ——— اور جتنے نام اور لے لیجیے، ہزاروں ہزار بلکہ لاتعداد شعرا میں ان چند ناموں کے علاوہ اور کون ملتا ہے میں یہ بات واضح کر دوں کہ میں شعرا کے اس سلسلے کی بات کر رہا ہوں جس کا تعلق ہماری غزلیہ شاعری کے مروجہ انداز سے رہا ہے نظیر، اقبال، مادمن، مربا نگد ھی تسلیم کرھاں اور پرویز شاہدی میراں جی جیسے دوسرے شعرا اور عہدِ جدید کے غزل گو شعرا اس زمرے میں نہیں آتے ہم ناموں پر اصرار نہ کریں بلکہ صرف یہ نکتہ سامنے رکھیں کہ انھی شعرا نے اپنی پہچان دی ہے جنھوں نے پرانی لکیروں سے ہٹ کر چلنے کی کوشش کی ہے، بلاشبہ ہر شاعر سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی ہے کہ وہ یکایک ایک بالکل منفرد، نئی اور غیر روایتی آواز لے کر سامنے آئے تبدیلی کا یہ پروسس نہایت آہستہ رو ہے قدیم اندازِ سخن میں مشق و ریاضت کرنے والے ہجوم کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا اس لیے کہ بالآخر نئی منزلوں کی مشق و ریاضت کا نتیجہ ہی ہوتا ہے اگر جوئے صد ہزار انجم نہ ہو تو

سحر میں پیدا نہیں ہو سکتی غرض جدید سے جدید تر کی تلاش ہر شاعر کا منصب و
مقصد ہوتا ہے روایتوں سے ہٹنا ایک فطری تحسین عمل ہے مگر جب کوئی ایک شاعر بھی ہوتا
ہے جو ہٹتا تو ہے مگر چھوڑتا نہیں وہ اسی پوری میراث کے ساتھ منتقل ہوتا ہے روایتوں
سے یکسر دست بردار ہو جانے والا شاعر جدت کی سطح میں اسی جدت کو جو خوشگوار سالمی
قائم نہیں کر سکتا اس لیے جدید انداز میں شاعری کرنے والوں کو روایت کے سارے گر
سے پورے طور واقف بھی ہونا چاہیے نہ یا مطربانہ اسی بحث سطر میں ابھرتا ہے

محاسنت باهمه وحشت تعلّق اوهام
نه ناله بیست میسر گسستن ز سحر

میرے ایک دوست ہیں جو آج بھی شاعری کے لیے قدیم اور روایتی ہئیت و پیکر لازمی
سمجھتے ہیں وہ معینہ بحور و اوزان اور نظام آہنگ سے ہٹ کر منظومات کو آزاد
نظموں میں دیکھنا گوارا نہیں کرتے میرا اور شاعری کے آہنگ پر ان سے بات ہوتی رہی ہے کہ
ان کا نظریہ ایک مکالمہ بھی ہے اور یہ ممکن بھی اس ضمن میں BENEDETTO CROCE
کے اس قول پر اکتفا کروں گا کہ:

Poetry is The Language of Feeling, Prose of The Intellect, But Since Intellect is Also Feeling, in its Concreteness and Reality, all Prose has its Poetical Side

گویا لے دے کر سارا معاملہ یہیں پر ختم ہوتا ہے کہ شاعری اساسی طور پر جذبے
نہایت جذبوں کے اظہار کا نام ہے احساسات کی شدت و کمی سے ہی شاعری اور نثر
کی حدیں مقرر کی جاتی ہیں ——— اور ظاہر ہے کہ یہ حد قطعی طور پر ہمہ تن
حاصل نہیں ہو سکتی میں نے اپنے تخلیقی رویے میں اسی تصور کی پاسداری کی ہے جہاں جہاں
میں پابند رہنے میں بھی آزاد ہوں اور آزاد رہنے کی پاسداری میں نے اپنے اوپر طاری
مسلسل کی ہے؛

من آنچہ شرط بلاغ است با تو میگویم
تو خواہ از سخنم پند گیر و خواہ ملال

اب شعری تخلیقات چھپ کر سامنے آتی ہیں تو وہ دوسروں کے لیے ہو جاتی ہیں، چنانچہ میرا یہ مجموعہ تخلیقات میرے قارئین کے لیے ہے۔ اشاعت و طباعت کے جملہ حقوق بحق مصنف ہونے کے سوا اب اس پر میرا کوئی حق نہیں رہا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ:

ما حال خویش بے سر و پا بستہ ایم

اب اس جرم کی جو سزا ہے وہ تو مجھے برداشت ہی کرنی ہے۔

اس کتاب کی اشاعت میں بہار اردو اکادمی کا مالی تعاون شریک ہے میں اس کے لیے اکادمی کے ارباب کا ممنون ہوں۔ اس جزوی مالی تعاون کے بعد بھی اگر جناب ساحر سنوی کا اصرار نہ ہوتا اور جناب محترم گوپال متل کی رہنمائی حاصل نہ ہوتی تو یہ کتاب ابھی اس معیار سے شائع نہیں ہو سکتی تھی۔ میں ان دونوں حضرات کا حد درجہ شکر گزار ہوں۔

(علیم اللہ حالی)

۲ ستمبر ۱۹۸۹ء

گہرائی سے ایک آواز



یہاں کیا ہے؟ وہاں کیا تھا؟
سوالوں کا یہ سادہ ڈھب
مرے بدلے ہوئے لہجہ کو معنی دے نہیں سکتا
مری آواز اُوپر آتے آتے ــــــ
ــــــ مری آواز ہی رہتی نہیں ہے
سماعت ساحلوں کی مطمئن ہوتی نہیں ہے
میں خود کہتا ہوں خود سنتا ہوں
وہ سنتا ہے خود اپنی ہی کہانی



غزل

سفر ہے دھند کا تو کوئی رہنما لے جا
مرا سکوت نہ ہو تو مری صدا لے جا

ہر ایک سمت ہے دشتِ سکوت کی وسعت
سجا کے یہ روشِ عرضِ مدّعا لے جا

میں زیرِ سنگ اسی تیرگی میں جی لوں گا
تو اپنی نرم شعاعوں کا قافلہ لے جا

کچھ اور چاٹ لے صحرائے گمرہی کا نمک
جو آگیا ہے تو راہوں کا ذائقہ لے جا

بکھر کے چھوٹ نہ جاؤں تری گرفت سے میں
سنبھال کر مجھے اے موجِ خوش ادا لے جا



نشاں بھولی ہوئی منزل کا

نشاں بھولی ہوئی منزل کا پہلے بھی تھا اب بھی ہے
مگر ــــ جس کا مقدر ہی سفر ہو
ــــ اور منزل کا برابر فاصلہ
ہر اک گردِ نامرادی کی لپیٹ میں لیا جاتا ہو
سفر اس کے لیے رحمت ہے یا ترکِ سفر
تازہ صعوبت سے نکلنے کا وسیلہ ہے

ــــ نہ جانے کتنی مدت سے
ہم آنکھوں پر ہتھیلی رکھ کے
ان لفظوں کی جانب تکا کرتے تھے
جہاں ابھی تھکن
دو چار لمحوں کے لیے آسودگی پاتی
مگر ہر راستہ تاریکیوں میں باری باری کھو گیا تھا
وہاں کچھ بھی نہ تھا

بس اک فریبِ منزلِ جاناں کی دھندلی روشنی تھی
جو بھر پارہ تلاووں کا سہانا دے رہی تھی
یہاں کچھ بھی نہیں ——
منزل —— مسرت —— روشنی —— رستہ
سبھی موہوم و مہمل سلسلہ کی مختلف کڑیاں ہیں
زنجیریں ہی زنجیریں !!
عقلمندو ! —— جہاں پر ہو
وہیں رک کر یہ دیکھو تم کہاں ہو



غزل



دل سے ارمانِ طلب کس سے دعا لے جائے
تم گئے تھے تو مرے پاس جو تھا لے جائے

مل کے چہرے پہ جا مقتلِ یاراں کا لہو
اور ہم کیا تری محفلِ سے بتا لے جاتے

دست و صحرا میں بھلا بوجھ اٹھاتے کیوں کر
ہم ترے در سے کہاں بارِ وفا لے جاتے

اس کو ہر راہ پہ ملنے کا گماں باقی تھا
مجھ سے ملنے کا نشاں اور وہ کیا لے جاتے



داستان

یہ طائر ——

جو ہر شام

کہنہ عمارت کے ٹوٹے کنگورے

پہ تا دیر

دن بھر کی سب داستاں کہتا رہتا ہے

—— اور وہ عمارت

گئے گزرے لمحوں کی ساری مصیبت،

ہر اک پل میں مسمار کرتی ہوئی ریزشوں

کی صعوبت کا غم

بھول کر

ان صداؤں میں یوں ڈوب جاتی ہے

جیسے —— یہ آواز ہی

اس کہن سالگی کا مداوا ہو

۲۵

جیسے — یہی اس کی ساری شکستوں کا حاصل ہو
دیوار و در کے کھسکے قدم
اپنے خالق سے
اک شام کی بھیک اور مانگ کر
اُس کہانی کے انجام کو جاننا چاہتے ہیں
— وہ کہانی
جو پسِ پردہ کے اظہار سے
آج بھی دُور ہے،

غزل

ہجومِ یار ترا، اور مرا ٹھکانا تو
اس اور چھوڑ بھی دے مجھ کو آزمانا تو

مرے لیے ہے مری نامرادیوں کا غبار
کہیں سے ڈھونڈھ بھی لے اس کوئی بہانہ تو

اُسے بھی اپنے فسانہ کی یاد آجائے
کہانی ایسی کچھ اس طور سے سنانا تو

تری شکست نے پہنچا دیا کہاں تجھ کو
حضورِ حسن بھی بھولا ہے سر جھکانا تو

میں اپنے آپ میں تجھ کو سمیٹتا کیوں کر
میں ایک لمحۂ محدود، اِک زمانہ تو

کوئی نہ دے پسِ دیوار جب صدا جانی
قریبِ منزلِ جاناں ہی بیٹھ جانا تو

لفظ، آواز، صورت گری

صداؤں کا سمندر یم بہ یم ہے
بپھرتی موج کے طوفاں میں لمحہ بھر
ٹھہرنا بھی ہے مشکل
سبھی کچھ بس سے باہر ہو رہا ہے
سکوتِ شور کی دیوار
اٹھتی جا رہی ہے
مرا دم گھٹ رہا ہے
مری آواز آوازوں میں ضم ہے
نہیں معلوم یہ سیلِ صدا
کس تک
ہماری نارسائی کا سبب بنتا رہے گا
نہیں معلوم یہ آندھی
غبارِ ناشناسائی کی کتنی گرد اسی

صورتوں پر ڈال جائے گی
تو پھر آؤ چلیں اس بارگہ سے
ہسر آدر کا مانگیں
اور بے چہرہ صداؤں کو
کسی پیکر کی صورت میں ابھاریں



لفظ، آواز، صورت گری

صداؤں کا سمندر سر بہ یم ہے
بپھرتی موج کے طوفاں میں لمحہ بھر
ٹھہرنا بھی ہے مشکل
سبھی کچھ بس سے باہر ہو رہا ہے
سکوتِ شور کی دیوار
اٹھتی جا رہی ہے
مرا دم گھٹ رہا ہے
مری آواز آوازوں میں ضم ہے
نہیں معلوم یہ سیلِ صدا
کب تک
ہماری نارسائی کا سبب بنتا رہے گا
نہیں معلوم یہ آندھی
غبارِ ناشناسائی کی کتنی گرد لائی

صورتوں پر ڈال جائے گی
تو پھر آؤ چلیں اس بارگہ سے
ہسر آدر کا مانگیں
اور بے چہرہ صداؤں کو
کسی پیکر کی صورت میں اُبھاریں

غزل

نظر لباسِ گل و لالہ ہی میں آ مجھ کو
صدا نہ دے تو خموشی سے دے پتا مجھ کو

کبھی تو روٹھ کبھی جا مجھ سے بے سبب اے دوست
میں کس طرح سے مناؤں گا آزما مجھ کو

کھلے ہوئے ہیں سمن زار تیری یادوں کے
تُو دے رہا ہے قفس میں بھی آسرا مجھ کو

گھٹا گھٹا سا ہے ہر سُو قفس میں سنّاٹا
کہیں سے دینے لگا ہے کوئی صدا مجھ کو

ہر ایک موجِ صدا مضمحل ہے زنداں میں
سنا دیا ہے فصیلوں نے بے نوا مجھ کو



سرِ شام

سرخ و سبز و نیل گوں پہنائیوں میں
لاسے لاسے
اُجلے پَر والی طلسماتی پری
شام کو ـــــ ہر روز مجھ کو
قاف کے انجان گوشے سے
اُتر کر
رنگ و خوشبو کے سمندر کے قریب
چھوڑ کر
خود ٹھنڈی لہریں
خواب کی آسودہ و خوش رنگ راہوں پر
نہ جانے کتنی دیر
اپنی آنکھیں بند کر کے
سارے گزرے اور بھولے منظروں کو

موتیوں کی طرح
اپنے دامنِ احساس میں
بھر کے آنکھیں کھولتا ہوں

اور پھر
لمبے لمبے، اُجلے پر والی طلسماتی پری
رات کے گمنام لمحوں میں مجھے
اپنے گھر کے راستے پر چھوڑ کر کہتی ہے
کل پھر آؤں گی



غزل

پسِ زنداں تری آواز زنجیریں ہلاتی ہے
ہوا روزن سے آئی ہے پیامِ یار لاتی ہے

فصیلیں تیشہ کاموں نے نئے انداز سے کھولیں
جدائی رفتہ رفتہ قربتوں میں ڈھلتی جاتی ہے

نہ شب گزری نہ دن آیا، نہ دن گزرا نہ شب آئی
تری آہٹ جب آتی ہے ہر اک شے رک سی جاتی ہے

اندھیروں میں بھی تیری یاد پہنچاتی ہے منزل تک
میں رستہ بھولتا جاتا ہوں وہ رستہ بتاتی ہے

میں آؤں گا تو خاکِ صحنِ زنداں لے کے آؤں گا
رہائی سے زیادہ مجھ کو رسمِ قید بھاتی ہے

یہاں بھی خوشبوئیں پھیلی ہوئی ہیں ان گلابوں کی
نئی ساعت پرانے موسموں کے گیت گاتی ہے

نظر کچھ بھی نہیں آتا ہے سناٹوں کی ظلمت میں
سماعت دُور تک جاتی ہے اور ناکام آتی ہے

اُترتا ہے کوئی پچھلے پہر پھیلا کے پَر ایسا
کوئی جیسے مجھ کو بزمِ یار تک راتوں کو لاتی ہے

کوئی منظر یہ واپس لا سکے گا اُن بہاروں کو
جو موج آتی ہے خالی دُور منزل کرتی جاتی ہے



آخری الزام

عقیدے،
گلیوں کے چند آوارہ مسخرے لونڈوں کی صورت
کھڑے ہوئے
اس غلیظ انبار پر مسکرا رہے ہیں
صحفِ اعلیٰ ـــــ کہ جن کو صدیوں سے
ہم نے پاکیزگی کی اونچی بلندیوں پر سجائے رکھا تھا
اب خس و خاک ہو چکے ہیں
بڑے بزرگوں، قدیم بھیجے ہوئے خدائی سفیروں نے
بھائی چارگی اور اخوت و آشتی کے جو کچھ
سماوی تحفے عطا کیے تھے
وہ سب کے سب اب
تمام پاکیزہ رشتے ناتوں کے ساتھ جل کر فنا ہوئے ہیں
تمام فقرے ـــــ کہ جو

مقدس رساں میں برکتی تاثر کا دعویٰ رکھتے تھے
اب ہمارے ہی ساتھیوں کے لہو میں
ڈوبے ہوئے پڑے ہیں
کہا گیا تھا کہ
میری رسّی کو اپنے ہاتھوں کی ساری طاقت سے تھامے رکھنا
اِدھر وہ رسّی کھلی ہوئی ہے
اُدھر وہ دستِ بریدہ فریاد کر رہے ہیں
یہ سدِ منتہٰی بتا رہی ہے
کہ اب بھی ان کی گرفت ڈھیلی نہیں پڑی ہے
یہاں بھی سورج ہے سر پہ رقصاں
یہاں بھی ہے آنسوؤں کی بارش
یہاں بھی بے سائگی کا عالم
اب اور کس طرح کوئی الزام سر چھپانے کا اپنے سر لیں



غزل

جز ہجومِ بیکراں کچھ بھی نہ تھا
سطروں کے درمیاں کچھ بھی نہ تھا

ان درختوں نے بھی بدلا تھا لباس
اپنے ناموں کا نشاں کچھ بھی نہ تھا

بے سبب ہم ڈر گئے تھے راہ میں
ورنہ زیرِ آسماں کچھ بھی نہ تھا

ہم نے پھیلایا بہت دستِ صدا
تا بہ حدِّ لامکاں کچھ بھی نہ تھا

مار ڈالا ہے یقیں کے کرب نے
مجھ کو وہ زہرِ گماں کچھ بھی نہ تھا

عمر بھر بس ہم ہی ہم حائل رہے
میرے اس کے درمیاں کچھ بھی نہ تھا

پا گئے لمحوں کے چلنے کی صدا
نا فریبِ حسنِ جاں کچھ بھی نہ تھا



انصاف

یہاں جہاں آج رہ رہا ہوں
اسیرِ زنداں کے جانے کتنے ہی قافلے
آ کے رُک چکے ہیں

یہ سرزمیں
کتنے معصوم بے گناہوں کو
جرم کی تیرگیوں میں جلا چکی ہے
وہ اپنے ناکردہ جرم کی
ان عدالتوں سے سزا کا اعلان سُن چکے ہیں
عدالتیں ـــــ وہ جو ابنِ آدم کے اندروں کے تغیرات
سے بے خبر رہی ہیں
عدالتیں ـــــ وہ جو فیصلوں میں صداقتوں
کے مقابلہ میں
دلائلِ خارجی کی بیباکیوں پہ

لسگڑا کے چل رہی ہیں،
عدالتیں ـــــ وہ جو حکمرانوں کی مختصر ٹولیوں کو
یزداں سمجھ رہی ہیں
جو جبر و تشدد کے لیے تشدد کے
اصولِ خود ساختہ کو میزاں سمجھ رہی ہیں
یہاں جہاں آج رہ رہا ہوں
یہاں جو آتے ہیں مجھ سے پہلے
یہاں جو ہم سب کے بعد آئیں گے
ایک اک کر کے ہم گناہ دوسرا کا عرفاں لے چلیں گے

وہ لفظ
جواں عدالتوں کی گرفت میں
آج تک نہ آیا
ہم اس کی سچیاں لے چلیں گے



غزل

اُس کا غم ایسی طلب جیسی کے لے جائے گا
درد بن کر مری رگ رگ میں اتر آئے گا

ریگزاروں سے پرے کھینچ رہا ہے کوئی
جانے کس دشت میں دریا مجھے بھٹکائے گا

بھول جاؤں گا میں جب ایسی ہواؤں کی کسک
اس کی آنکھوں میں لہو میرا اُتر آئے گا

کوئی پتھر کا نشاں رکھ کے جُدا ہوں ہم تم
جانے یہ پیڑ کس آندھی میں اُکھڑ جائے گا

ساتھ ہو جا کہ اُمڈتی ہوئی لہریں ہیں قریب
جب اتر جائے گا دریا تجھے تڑپائے گا

میں اسی موڑ پہ مل جاؤں گا جانی تجھ سے
تُو جہاں بھیڑ میں گُم ہو کے بچھڑ جائے گا



ھواؤں کا حصہ

درختوں کے پتے
جو شاخوں سے ٹوٹے
تو کچھ دیر تک
مہرباں، نرم و نازک
ہواؤں کی آغوش میں
ابھی آسودہ ساعت یہ ہنستے رہے
مگر لمحہ لمحہ
زمیں نے انھیں بھی فضا سے اتارا
ہواؤں کے حصّہ میں کب کیا رہا ہے
کسی دم میں چھن ہی گیا یہ سہارا
ہواؤں نے گرتے ہوئے سوکھے پتّوں کو
لمس وداعی دیا
اور رخصت کیا
ہواؤں کے حصّہ میں کب کیا رہا ہے



غزل



دشتِ خاموش میں گمنام ہوئی جاتی ہے
ہر صدا نطق پہ الزام ہوئی جاتی ہے

تو جو ساحل ہے تو آغوش میں رکھ لے اسی
لہر کیوں راہ میں ناکام ہوئی جاتی ہے

ہر ادا عشق کی اب اہلِ ہوس جان گئے
اب تو ہر راہ رہِ عام ہوئی جاتی ہے

اس حقیقت سے ہر حال میں سہہ جائے گی
زندگی خوگرِ آلام ہوئی جاتی ہے

کن سبیلوں سے کہاں پیاس بجھائی تھی علیم
ہر قدم پر ہوسِ خام ہوئی جاتی ہے



دِلش زندہ شد

دھوپ اتنی تیز ہے —— محبس سے مقتل دُور ہے
اتنی جلدی بھی ہے کیا
رات جب آئے گی
سب کچھ رفتہ رفتہ ظلموں کی گود میں چھپ جائے گا
ڈھول تھک کر سو رہے گی
دھوپ کا طوفاں تھم جائے گا
راہیں سرد ہوں گی
آج کا دن
ماضی اخباروں کے مدفن میں فنا ہو جائے گا
آنے والی رات کا پچھلا پہر
اس کہانی کو انوکھے موڑ پر لے جائے گا
مرنے والے کو حیاتِ دائمی دے جائے گا
اپنے ہاتھوں میں لیے مشعل ابد تک
آنے والی ان گنت راتوں میں وہ
اس راستے سے جائے گا

غزل

دشتِ خاموش میں گمنام ہوئی جاتی ہے
ہر صدا نطق پہ الزام ہوئی جاتی ہے

تو جو ساحل ہے تو آغوش میں رکھ لے اپنی
لہر کیوں راہ میں ناکام ہوئی جاتی ہے

ہر ادا عشق کی اب اہلِ ہوس جان گئے
اب تو ہر راہ رہِ عام ہوئی جاتی ہے

اس جفا پیشہ سے ہر حال میں سہہ جائے گی
زندگی خوگرِ آلام ہوئی جاتی ہے

کن سبیلوں سے کہاں پیاس بجھائی تھی سلیم
ہر قدم پر ہوسِ جام ہوئی جاتی ہے



دِلش زندہ شد

دھوپ اتنی تیز ہے — محبس سے مقتل دُور ہے
اتنی جلدی بھی ہے کیا
رات جب آئے گی
سب کچھ رفتہ رفتہ ظلمتوں کی گود میں چھپ جائے گا
ڈھول تھک کر سو رہے گی
دھوپ کا طوفاں تھم جائے گا
راہیں سرد ہوں گی
آج کا دن
باسی اخباروں کے ملبوں میں فنا ہو جائے گا
آنے والی رات کا پچھلا پہر
اس کہانی کو انوکھے موڑ پر لے جائے گا
مرنے والے کو حیاتِ دائمی دے جائے گا
اپنے ہاتھوں میں لیے مشعل ابد تک
آنے والی ان گنت راتوں میں وہ
اس راستے سے جائے گا

غزل

مسافر کہاں جائے گا اِس طرف
پلٹ آئے گا راستہ اِس طرف

اُدھر دشت در دشت میں گامزن
ڈراتا رہا رہنما اِس طرف

سوالوں کے قیدی نہ ہم تھے نہ تم
نہ کیوں اُس طرف تھا نہ کیا اِس طرف

اُدھر سنگِ تہمت ہر اِک ہاتھ میں
کوئی جسم تیشہ نما اِس طرف

کرم تیرا ترکِ تعلق نہ بھی
کہاں مجھ کو لے جائے گا اِس طرف

بھٹک کر تری سمت آیا تھا میں
ملی منزلِ گم شدہ اِس طرف

کہانی اُدھر بڑھ رہی تھی علیم
مجھے خوف انجام کا اِس طرف

نرگسیت

تم بھی کیا سادہ ہو، کتنے نیک ہو
سارے چھوتے اور اچھوتے غم کو
چھو لینے کی یہ خواہش بھی
کیا مہمل ہے، کیسی خود فریب
آئینہ جھوٹا ہے اس کو چھوڑ دو
یہ طلسمِ خود فریبی توڑ دو
روز سطحِ آئینہ پر مسکرا کر ملنے والے
شخص کی باتوں پہ کب تک جاؤ گے



غزل

جو بھی ہے اس کے ذہن میں وجہِ گماں جلا
اے شعلگیٔ شوق مرے جسم و جاں جلا

جم جائے گا بدن کا لہو سرد لہر سے
آ لمسِ آتشیں سے یہ وقتِ گراں جلا

ہو شکوۂ ستم کا تصوّر تو وہ غلط
یہ بات اگر زباں سے نکلے زباں جلا

وہ ماہ و سال جل گئے اک پل کی آگ میں
لمحوں میں ایسا خیمۂ عمرِ رواں جلا

میں بھی تو ایک بار چلاؤں ستم کے تیر
ان کو بھی اے غرورِ تہیۂ امتحاں جلا

۵۰

اک آگ تھی جو پھیل گئی یاں سے واں تلک
شعلہ تھا یہ زمیں کا مگر آسماں جلا

ہمسایہ کی حسیں عمارت میں تھا مکیں
جلنے کو اس طرح سے یہ حالی مکاں جلا

ہر صوت و حرف رقص میں آزاد ہو علیم
صحنِ ہنر میں رشتۂ لفظ و بیاں جلا

آتے شبِ سکوت میں نورِ صدا نظر
حالی کچھ اس ادا سے چراغِ فغاں جلا

شکستِ حصار کے بعد

اور پھر
اس نے خود اپنے ہاتھوں
جو دیوار چاروں طرف کھینچ رکھی تھی
اسے توڑ ڈالا
تب وہ آزاد پانی تھا
سرمست پھیلا ہوا
چشمۂ بے کراں تھا
زمیں اس سے خوش تھی
فلک اس کی سرسبز نوید کا ملتجی تھا
پہاڑ اور بستی
بلندی و پستی
گھنے جنگلوں کے بھیانک مناظر
نئی اور پرانی طرح کی یہ آبادیاں ——

سب کے سب اس سے خوش تھے
کہ وہ ان کا ہمراز تھا' دوست تھا
وہ ان سب سے یوں آشنا ہو گیا کہ
اسے اپنے اندر سمیٹے ہوئے
سب کو آسودگی تھی
وہی ذات ہر ذات میں جذب ہونے لگی تھی
اسے یوں لگا
جیسے وہ منتشر ہو کے گم ہو رہا ہے
وہ پھر چاہتا تھا کہ سمٹے
سمٹ کر فصیلوں کا پابند ہو کر رہے
اسے خود نگر ہونا ہی چاہیے تھا



غزل

گزرا ہر ایک شخص مجھے دیکھتا ہوا
گویا میں آدمی نہ ہوا آئینہ ہوا

وہ دُھند تھا، دھواں تھا کہ ظلمت کہ روشنی
اب یاد بھی نہیں ہے کہاں تُو جدا ہوا

جب کوئی شعر ہو تو اسی کا خیال ہو
جب راہ گم ہوئی تو وہی رہنما ہوا

نکلی ہی تھی کہ شاخ طلب خشک ہو گئی
ہر بار ہم نے ہاتھ سمیٹا بڑھا ہوا

اب اپنی رسم و راہ نئے موسموں سے رکھ
وہ سایہ دار پیڑ خزاں آشنا ہوا

اُن پر نئی رتوں کے نشاں بن چکے ہیں آج
جن پتھروں پہ نام تھا ایسا لکھا ہوا

ہم کھل کے رو لیے تو کچھ ایسا لگا علیمؔ
برسوں کا کوئی قرض تھا جو اب ادا ہوا

یہ بھی سچ، وہ بھی سچ

لمحہ لمحہ بدلتے ہوئے وقت میں
کون کس کا ہے؟ کیا ہے؟ کیسے پوچھیے؟
میں بھی، وہ بھی، سبھی
اپنے چہروں کی
مٹتی بگڑتی لکیروں کو پہچانتے ہی نہیں
آنے والی رتوں کے چلن جانتے ہی نہیں

روز و شب
ایک اک پل میں مسمار ہوتی ہوئی
کہنہ دیوار و در
ریزتوں میں ہمیں دفن کرنے کی
سازشوں میں مصروف ہیں
آخرش اپنے چہروں کو اب ہم چھپائیں کہاں
آج تک ہم وہی ہیں

تبائیں کیسے، دکھائیں کہاں ؟ ؟

وہ جو ہم نے شروع سفر
اپنی آنکھوں پہ ہاتھوں کا پردہ تنا
اور سب ماہری منظروں سے کنارہ کیا
اور چلتے رہے
روز و شب ماہ و سال و صدی
ہم نے اس سب کی پہچان ہی چھوڑ دی

اور پھر یہ ہوا
رشتۂ صدق ٹکڑوں میں بٹتا گیا
وہ بھی سچ ہے جسے چھوڑ آتے ہیں ہم
یہ بھی سچ ہے جسے چھوڑ جائیں گے ہم
یعنی جو آج ہے
وہ بھی سچ ہے گذشتہ دنوں کی طرح
ہم کہ کل کے امیں
آج کو اپنی خاطر میں لاتے نہیں



غزل

شکستہ تھی، نہ تھا سیلاب پھر بھی
مری کشتی ہوئی غرقاب پھر بھی

حیا ہے حدِ ترکِ گفتگو تک
مری خاطر ہے وہ بیتاب پھر بھی

تبسم بھی لبوں پر چشم نم بھی
کہ رخصت کے ہیں کچھ آداب پھر بھی

تھکن راتوں کی رخصتی جا رہی ہے
مگر ہیں دور میرے خواب پھر بھی

سمرِ متاعِ تعلق جل چکا ہے
مگر نخلِ جنوں شاداب پھر بھی

ہر اک شے جیسے ردائے خامشی میں
فضا میں ایک پیچ و تاب پھر بھی

بھلا کر مطمئن سویا تھا خالی
مری آنکھوں میں اس کے خواب پھر بھی



دوام 1

دیواروں سے اندر آنے کی چاہت میں

زور
شعاعیں سورج کی
گھر سے باہر
آجاتی تھیں
موٹی موٹی دیواروں سے

اوّل اوّل
نرم اور دھیمے لہجے میں
——— اور گھنٹوں کی
ناکام مشقت سے گھبرا کر
سر ٹکراتی تھیں
دیواریں پھر دیواریں ہیں
تیز شعاعیں دھیرے دھیرے

پیاسا ہو کر
شب کی کالی چادر اوڑھ کے آخر
سو جاتی تھیں
روز ہی اِک جنگ کا منظر
روز مگر انجام پُرانا
آج مگر —— یہ نرم شعاعیں
دیواروں سے داخل ہو کر
فتح کا ایسی جشن مناتی
ناچ رہی ہیں،



غزل

میں چپ رہا کہ وہی اب مجھے صدا دیتا
مری نوائے شکستہ کا خوں بہا دیتا

ہر ایک طاق پہ روشن ہے مشعلِ آواز
وہ جا رہا تھا تو یہ روشنی بجھا دیتا

کھلا تو پھر کفِ احساس میں نہ تھا کچھ بھی
وہ شہر یار بھی آکر قریب کیا دیتا

وہ دور تو نہیں لیکن قریب بھی تو نہ تھا
صدا لگا کے ہی احساسِ فاصلہ دیتا



انت

ریزہ ریزہ
اترتی ہوئی شام جب
رات کی اوٹ میں
سب کی نظروں سے اوجھل ہوئی
رفتہ رفتہ
ٹہلتی ہوئی
نرم و آسودہ دریا کی گہرائیوں میں اترنے لگی
صبح تک
تہہ میں بیٹھی ہوئی جل پری
وہ کہانی سنائے گی جو
کل ادھوری رہی
آج بھی جس کی تکمیل ممکن نہیں
وہ کہانی

جسے روز و شب کی ہر اک آنے والی اکائی
نیا طول دے کر
وقت کی وسعتوں کا تمسخر اڑاتی رہی
اور پھیلا ہوا وقت
ایسی بے معنویت بہ سرمدہ ہے
ہر فسانہ جسے ہم نیا کہہ رہے ہیں
ایک بے انتہا داستاں
کی کوئی بیچ کی اک کڑی ہے
کوئی بات تازہ نہیں
کوئی واقعہ اجنبی اور انوکھا نہیں
کوئی شکل بھی نامناسا نہیں

مرے دستِ احساس نے
جب بھی کوئی نئی آشنائی
کو چھونے کی کوشش کی
ہر بار ہاتھوں میں
گزرے دنوں کے خدوخال تھے
بس وہی روز و شب اور مہ و سال تھے
سب نئے حادثے کہنہ تمثال تھے



غزل

سبھی کچھ تھا منظر میں منظر نہ تھا
سمندر میں تھا اور سمندر نہ تھا

کھلی آنکھ میں تتلیوں کا تھا رقص
بڑھا ہاتھ تو کوئی پیکر نہ تھا

لرزنے لگا بے سبب جسمِ آب
مرے ہاتھ میں کوئی پتّھر نہ تھا

ہوا آج عنقائے معنیٰ شکار
کوئی میرے تیروں کی زد پر نہ تھا

لگا کر گیا کون دروازہ پھر
اگر کوئی کمرے کے باہر نہ تھا

مجھے رر تنہائیوں نے کیا
مرے ساتھ یادوں کا لشکر نہ تھا

ہم اس سے جو بچھڑے تو ایسے ہوئے
کسی غیر کا، غیر کا گھر نہ تھا

سوال

اب کہ موسم ہمارے تمھارے لیے
زرد پتّوں کے شاخوں سے
رخصت کا
غمگیں مگر دل نشیں گیت گاتا ہوا آ گیا
ایک آندھی چلی
—— اور بس
وہ گھروندے جو ہم تم نے
اک دوسرے سے علیحدہ بناتے ہیں
اپنے حصاروں سے آزاد ہوں گے
یہ گڈّا، یہ ننھا سپاہی، یہ گھوڑا
یہ دولہا
وہ گڑیا، وہ چڑیا، وہ گھوڑی
وہ دلہن

—— مجھے تو یہیں ہے
تمھیں کیا یقیں ہے
کہ یہ زرد پتّوں کے گرے
جنوں خیز طوفاں کے اٹھے
ہواؤں کے چلنے
—— یہ یوں ہی رہیں گے ؟
وہ دوری جو آج اپنے اپنے
گھروندوں میں ہے
کیا یہی فاصلہ کل بھی قائم رہے گا ؟ ؟



غزل

محرم بہت بڑے تھے تری بارگاہ کے
بے مائیگی بھی ساتھ تھی ہم کج کلاہ کے

ترتیبِ حرمِ سادہ دلاں بھی ہوئی تمام
بدلے گئے ہیں رنگ سپید و سیاہ کے

دشتِ طلب میں تیرا نشاں مل گیا تو پھر
سب فاصلے سمٹ گئے حدِ نگاہ کے

مانا کہ وہ حسنِ وفا اب نہیں مگر
اسباب اور ڈھونڈ لیں کچھ رسم و راہ کے

آنکھوں میں رات کاٹ کے ہر روز میں علیم
عنواں لکھ رہا ہوں تری خوابگاہ کے



دوسری ساعت

یخ زدہ ٹھنڈی ہواؤں میں
ٹھٹھرتے جسم سے
جب میں نے کمرے میں پہنچ کر
آگ روشن کی
تو وہ پہلی تمازت میں ملا

موسم گرما کی
پگھلی دوپہر میں
آگ اگلتے راستوں سے کچھ پرے
اک گھنیرے پیڑ کے سائے میں
جب پہنچا
تو پہلی ساعتوں میں

وہ مرے ہمراہ تھا

رات پہروں تک نہ تھا اس کا پتہ
ہاں مگر جب بند سے اوجھل ہوئے
سدّ ہونے سے معاً پہلے
فقط اک آنِ واحد کے لیے وا ہو گئے
میں نے دیکھا
وہ وہاں موجود تھا

وہ مرے افسردہ لمحوں میں
مرے چہرے پہ غم کی لہریں
دیکھ کر
کربِ غم سے چور
اک پل کے لیے آیا مگر
پھر آنکھ سے اوجھل ہوا
وہ مری عزلت، مری ہر اک صعوبت کا رفیق
وہ مرا ہمراز، میرا غم گسار
مجھ سے مل کر دُور ہو جاتا ہے کیا
دوسری ساعت میں کھو جاتا ہے کیا



غزل

ہے غمِ ہجر نہ اس ذوقِ طلب کچھ بھی نہیں
آج تم لوٹ کے آئے ہو کہ جب کچھ بھی نہیں

تیرے ٹھکرانے کی نسبت سے ہوئے ہیں مشہور
ہم فقیروں کا یہاں نام و نسب کچھ بھی نہیں

آج یہ بارِ ملاقات اٹھے گا کیوں کر
اس سے ملنا ہے یہ ملنے کا سبب کچھ بھی نہیں

ایک آوارہ توڑی ہے جموتی میری
ڈھونڈھتا ہوں تو پسِ ساحلِ شب کچھ بھی نہیں



تسکلوں کو
صحراتے فراموتی ییں حاکر چھوڑ آتی ہے
تو آحر رلط یس مسطر کا کیا ہے ان مساطر سے
سمجھ میں کچھ ہہیں آتا
سفر آحر سفر ہے'

اُسے میں ایک اِک منظر میں دیکھوں
اُسے ہر شے کے اندر چاہتا ہوں

وہ جتنا چاہتا ہے مجھ کو حالیؔ
اُسے اُس سے کہیں بڑھ کر چاہتا ہوں



پہلے جیسا

سب کچھ پہلے جیسا ہے
کل ہی میں دیکھ آیا ہوں
سرخ چناروں کا باغیچہ
ریت بھری وہ راہگزر
——— راہگزر پر اپنے قدموں کی وہ چھاپ

وہ پتھر تو اب بھی
اپنے جسم کی گرمی، اپنی خوشبو
اپنے سینے کا رکھوالا
اور وہ بخشش والا
پھلا پھیلا ——— ہر جانب سے سایہ کرتا پیڑ
اس سے پرے وہ دوب کی تختی
پانی کی سیلانی کا پل
وہ ست رنگی چڑیا

وہ ایسے رازوں کی شناسا
ہاں وہ اب بھی ویسی ہی ہے
روغن رنگت، لمعہ نکہت، بادل جھونکا
اتنے دنوں میں کچھ نہیں بدلا
کل ہی میں دیکھ آیا ہوں
سب کچھ پہلے جیسا ہے



غزل

یہ در کھلا ہے کہ اس سمت بھی تو آئے ہوا
میں مر رہا ہوں گھٹن سے مجھے بچائے ہوا

کہ اب تو کھول دیے بادباں بھی ہم نے
ہماری ناؤ کدھر جائے گی بتائے ہوا

اندھیری شب میں ابھی تک ہیں سسکیاں جاری
گئی رتوں کا یہ نوحہ نہ اب سنائے ہوا

اسی فضا میں کہیں خوشبوؤں کے ساتھ ہے وہ
جو آرہی ہے تو ساتھ اسے اس کو لائے ہوا

فضا میں پھر کوئی پتھر کسی نے پھینکا ہے
ہر ایک سمت سے آتے ہیں نالہائے ہوا



پناہ مانگتا ہوں

میں حقیقت کے روشن، چمکدار و خوش رنگ
رخسار کے خواب میں مست تھا
آنکھ کھلتے ہی میں ڈر گیا
کالی کالی نقابوں میں
ہر سمت
دہشت کے عفریت
اتنی مکروہ و دلدوز آواز میں
چیختے بڑھ رہے ہیں
خدارا انہیں روک لو
مجھ کو خوابوں کی تہہ میں چھپا دو
ایک بار اور مجھ کو سلا دو



غزل

جنس بھی تجھ سی بہت مجھ سے خریدار بہت
بھیڑ ہے لوگوں کی، ہیں شہر میں بازار بہت

آج پھر ہو نہیں پائی کسی قاتل کی شناخت
اور تھے نعشوں کی پہچان کے آثار بہت

دیر تک سطح پہ آواز کی لہریں تھیں رواں
ڈوبنے والے کی چیخوں میں تھی جھنکار بہت

گر پڑوں میں تو اٹھائیں گے گہر جاں کے لوگ
تیرے دامن میں اگرچہ ہوں گراں بار بہت

ٹوٹتی ہی نہیں صدیوں سے یہ زنجیرِ طلب
جسم کی قید میں ہیں عشق کو آزار بہت

ختم ہو جائیں گی اک دم میں سرابوں کی حدیں
تیز کر لی ہے نفس نے مرے رفتار بہت

گم ہوئی جاتی ہے ہر راہ گزر اس جا کی
واپسی اگلے سفر سے بھی ہے دشوار بہت



عذاب

یاد ہے شہر کے لوگوں کو ابھی تک وہ بات
ہم جسے اپنے تئیں بھول چکے ہیں شاید
وقت کی سرعتِ رفتار کے باوصف کہیں
چند لمحات سرِ راہ رُکے ہیں شاید

جب کبھی ملتا ہے کوئی راہ میں دیرینہ رفیق
دشتِ ماضی میں بہت دُور تلک جاتا ہے
نیم خوابیدہ دھندلکوں میں مجھے بہکا کر
چھوٹ جاتا ہے کہیں خود ہی بھٹک جاتا ہے
اور مرا ذہن اندھیرے کی مسافت کا شکار
سوچ کی سخت گزرگاہ پہ تھک جاتا ہے

جاگنے لگتا ہے سویا ہوا برسوں کا عذاب
درد چبھتے ہوئے ہیروں کی طرح آتے ہیں

ہڈیاں آگ کی یورش سے لہک اٹھتی ہیں
جسم و جاں زہر سے افسردہ ہوئے جاتے ہیں
ٹوٹنے لگتی ہے رگ رگ میں کوئی گرم سی شے
ایسے ہی قطرۂ خوں جسم کو گرماتے ہیں

مجھ کو تنہائی میں لے جاتے ہیں ہمدم میرے
اور مرے جسم پہ تیزاب سا برساتے ہیں

جانے کب ایسے جہنّم سے نکل پاؤں گا
کب ملے گی مجھے دیرینہ رفیقوں سے نجات
ہم جسے اپنے تئیں بھول چکے ہیں شاید
یاد ہے شہر کے لوگوں کو ابھی تک وہ بات

غزل

گام گام تاریکی اور یہ سفر تنہا
میں پہنچ نہ پاؤں گا آج اپنے گھر تنہا

کس مکاں سے نکلی تھی میرے نام کی آواز
کوچہ کوچہ حیراں ہوں اور دربدر تنہا

حرمِ خود نگاہی پر فیصلہ یہی ٹھہرا
بارِ زندگی ڈھونا اور عمر بھر سہنا

تیز دھوپ میں جاتی سایہ سایہ اس کی یاد
زندگی گزرتی ہے جس کے نام پر تنہا



ارادہ

آج کے بعد نہ جانے پھر کب
دل میں یہ درد اٹھے، روح میں بے تابی ہو
ساعتیں سانس کے رستہ میں رکاوٹ بن جائیں
کوئی کانٹا سا رگوں میں میرے
خون کے ساتھ رواں ہو جیسے
دستۂ یادِ رفیقاں کا کرم
سینۂ ہجر نصیباں کو ملے
جانے کب
صحنِ جاں میں نئے گلزار کھلیں
آسمانوں سے اترتی ہوئی بے نام سی شے
کب دیارِ دلِ ویراں میں بسے
آج بس آج ہی ہر غم کو مکمل کر لیں
بارشِ اشک کا طوفاں اُٹھے
لمحہ لمحہ میں بٹے درد کے رشتے
کو مسلسل کر لیں



غزل



آوازِ حرم ہے تو خموشی سے کام لوں
کچھ یوں بھی اہلِ شہر سے میں انتقام لوں

بے مایہ پستیاں ہی مقدّر میں ہیں مرے
بک جاؤں بھی کسی سے تو کیا اس سے دام لوں

زینوں پہ چڑھ کے ناپتے ہیں لوگ اپنے قد
بیٹھوں کہاں یہ بزم میں میں کیا مقام لوں

چھوٹی نہیں ہے مجھ سے ابھی وضعِ کشتگاں
ہو دوست بھی کوئی تو میں دشمن کا نام لوں



۸۷

مے مصلحت کی رکھی ہے زہر آما بھی ہے
تم بھی اٹھاؤ بزم میں اک میں بھی جام لوں

آجائے وقت قبضۂ قدرت میں گر کبھی
وہ ساعتیں طلب کروں وہ صبح و شام لوں



پیامِ اشک

سرِ نوکِ مژہ اِک قطرۂ اشک
مثالِ دُرِّ تاباں جلوہ گر ہے

ہے محرومِ زباں گرچہ یہ قطرہ
ملا کی تابِ گویائی مگر ہے

بیاں پابندِ حرف و صوت کیوں ہو
خموشی میں بھی کوئی نغمہ گر ہے

سکوں میں بھی بپا ہے ایک محشر
شبِ تاریک میں بھی اک سحر ہے

حقیقت ذرّے ذرّے سے ہے ظاہر
حقیقت پھر بھی مشروطِ نظر ہے

صدائیں دے رہی ہے ایک اک شے
مگر انساں اس تک بے خبر ہے

نہ دیکھے قطرے قطرے میں جو دریا
نظر وہ بھی بھلا کوئی نظر ہے

نشاط و غم الگ بھی ساتھ بھی ہیں
غرض اک دوسرے پر منحصر ہے

متاعِ آگہی ہے خود مسرت
فغاں بھی اک پیامِ خوشتر ہے

علیم اللہ حالی زندگی میں
بصیرت ہی اندھیرے میں شرر ہے

سر نوکِ مژہ یہ قطرۂ اشک
نشاط و حق کا اک پیغام بر ہے



غزل

کل جو تنہائی میں آ بیٹھا تھا تو
دیر تک کرتا رہا میں گفتگو

بھر اسے یا بادۂ عرفاں سے تو
توڑ دے یا پھر مرے دل کا سبو

تھک گیا میں دے کے خود اپنی صراحت
اور لوگوں میں ہے میری جستجو

پتھروں پر چھا گئیں شادابیاں
کام آخر آگیا میرا لہو

تُو کسی سانچے میں اس کو ڈھال دے
ورنہ گُم ہو جائیں گے یہ رنگ و بُو

وقت کے پتھراؤ سے میرا وجود
ریزہ ریزہ منتشر ہے چار سُو



مسافر سے!

کنارِ دشت تشنہ اک چمن رنگ و نور بھی ہوگا
مسافر چل! اسیرِ منزل ترا غم دور بھی ہوگا

لبِ تشنہ کو مل جائیں گی چھینٹیں بھی گلابوں کی
کھلے گی تیز گاموں پر حقیقت ان سرابوں کی

نشانِ رہ گزر جو منزلوں کے روپ میں آکر
چرا لیتے تھے قدموں سے ترے ذوقِ سفر اکثر

مسافر چل! ہوئی ہے اب سپیدیِ سحر پیدا
ترے قدموں کی ٹھوکر سے ہے ظلمت میں شرر پیدا

رفیقانِ سفر اک دوسرے کا بوجھ اٹھائیں گے
نہ اس بارِ الم سے تیرے شانے جھکنے پائیں گے

ہٹیں گے راہ سے پتھر، سلاسل ٹوٹ جائیں گے
ہوائیں کھلکھلائیں گی، عنادل گیت گائیں گے

نئے جلووں سے ہوگی صورتِ جاناں کی تابانی
نئے تیور، نئی رنگت، نیا اندازِ رعنائی

سبیلیں تشنہ کاموں کے لیے ہیں رہگزاروں میں
قرار آنے لگا ہے رہرو رفتہ بے قراروں میں

مسافر چل کہ آخر ختم ہیں اب مشکلیں ساری
ترے قدموں پہ سجدہ ریز ہوں گی منزلیں تیری



غزل

جدا کیا تو بہت ہی ہنسی خوشی اُس نے
بدل دیا ہے اب اندازِ رہی اُس نے

وہ رنگ رنگ اُڑا خوشبوؤں میں پھیل گیا
جھٹک دیا تھا مرا دامنِ تہی اُس نے

جسے سنا کے مجھے خوفِ سرزنش سا رہا
اُسی کلام پہ بڑھ چڑھ کے داد دی اُس نے

وہ میرے ساتھ شروعِ سفر چلا تھا مگر
ہجومِ شہر میں لی راہ اور ہی اُس نے

ہوا ہوں جرأتِ جُرمِ وفا سے بھی محروم
سزا یہ دی کہ خطا میری بخش دی اُس نے

اب ایسی کوئی صدا ہے نہ ایسا کوئی پتہ
بلا دیا ہے مجھے رہبرِ آگہی اس نے

درِ سکوت نہ جانے بہت ہے شورِ صدا
بپا کیا ہے وہ طوفانِ خامشی اُس نے



شکستہ تنہائی

وہ کیا ہے جو تنہائیوں میں خلل ڈالتا ہے
کبھی جسم بن کر
مجھے لمس کا ذائقہ بخشتا ہے
کبھی صوت بن کر
سماعت میں رس گھولتا ہے
کبھی سات رنگی دھنک سے
مجھے جھانکتا ہے
کبھی خوشبوؤں کے تھپیڑوں سے
میری تھکی، مضمحل، نیم خوابیدہ
ہستی کو بیدار کرتا ہے ـــــ لیکن
میں جب اپنی مشتاق نظروں سے دیکھوں
ـــــ نظر بھی نہ آئے
میں جب اس کی جانب بڑھوں

——— بھاگ جائے
میں جب اس کی آواز پر کان ڈالوں

——— وہ چپ!!
کچھ سنائی نہ دے
کچھ دکھائی نہ دے
صدا، رنگ، نکہت، صبا، جسم، لذت
یہ سب میرے دشمن
مجھے وہ فضا دے
جو سچ مچ
مجھے میری تنہائیوں سے ملا دے



غزل

بے صدا لمحوں کو یارائے سماعت دیجیے
اپنی ہی آواز میں پاؤں وہ قدرت دیجیے

خوں صفت منظر کا جاری ہے یہاں رقصِ جنوں
رخصتِ نظارہ آنکھوں کو ابھی مت دیجیے

جسم و جاں تک بھی نگل جائے گا صحرا کا سکوت
چیخ کر کانوں کو اک شورِ قیامت دیجیے

دستکیں تو شوخ ہوائیں بھی دیا کرتی ہیں روز
اور کوئی اپنے ہونے کی علامت دیجیے

ٹوٹ کر بکھروں کہاں اس تنگنائے ذات میں
پائے وحشت کو مرے صحرا کی وسعت دیجیے



بازیافت

آج پھر دروازۂ جاں پر ہے دستک کی صدا
تاک میں اب بھی ہیں شاید دشمنِ شہرِ سکوت
اندرون و بیروں ابھی تک برسرِ پیکار ہیں
یہ صدا اک آنے والے زلزلے کا ہے ثبوت

جانے کب ٹوٹا تھا رشتہ منظروں کا دید سے
مشعلیں آنکھوں کی کس عالم میں جانے گل ہوئیں
بہہ گئے سیلاب میں دیوار کے سارے نقوش
اور ہوائیں سب گھروندے ساتھ اڑا کر لے گئیں

مضمحل سی خامشی صحرائے بے پایاں میں ہے
لمس پھر محسوس ہوتا ہے کسی آواز کا
منتشر سا ہو رہا ہے کچھ فضاؤں کا سکوت
آج پھر دروازۂ جاں پر ہے دستک کی صدا

غزل

صداؤں کے جنگل میں وہ جاگتی ہے
کہ میں نے ہر آواز تیری سنی ہے

اُداسی کے آنگن میں تیری طلب کی
عجب خوشنما اِک کلی کھل رہی ہے

نیا رنگ تھا اس کا، کل وقتِ رخصت
کہ جیسے کسی بات پر رو رہی ہے

اسے دے کے سب کچھ میں یہ سوچتا ہوں
اسے اور کیا دوں ابھی کچھ کمی ہے

وہی لمحہ لمحہ لہکتا ابھی تک
ابھی تک اسی یاد کی تشنگی ہے

سبیلیں مرے نام کی اور بھی ہیں
مگر پیاس مجھ کو تری بوند کی ہے

ترا نام لوں سامنے سب کے حالیؔ
یہ چاہت مرے دل کو اسا کاٹتی ہے



آسماں لہکتا ہے
رنگ رنگ سا ہر سو
اپنا دل لبھاتا ہے

بادِ صبح کی خنکی
برگ و بارِ بے پایاں
خندۂ گل و بلبل

مہوشاں بے پروا
سب بہار کے ساماں

اب ہم ایسے موسم میں
جنگ کر نہیں سکتے

فصلِ روح پرور میں
دونوں مر نہیں سکتے

آج ایک ایک لمحہ
زندگی سکھاتا ہے
خندگی ستاتا ہے

آج ایسے موسم میں
جنگ ہو نہیں سکتی

اے اپنے خیموں میں
دونوں لوٹ جائیں اب



غزل

لب بھر جال کھولتے رہا
آئینہ رکھ کے بولتے رہا

بھیڑ میں ہے تو مل ہی جائے گا
چہرہ چہرہ ٹٹولتے رہا

ایک اِک بوند ہے گہر شب تاب
موتی آنکھوں سے رولتے رہا

لمحہ لمحہ شمار میں لایا
جسم میں زہر گھولتے رہا

دشمنی کا سراغ پا لو گے
دوستوں کو ٹٹولتے رہا



واپسی

اسی حمرتی میں
عمر بھر کی سعی نسائی
صداؤں کا احتساب کرلوں
یہی وہ لمحہ ہے
جب رواں ساعتوں
کو حکم قیام دے کر
پچاس برسوں کی ساری گم گشتہ
آہٹوں کا حساب کرلوں
اسی بظاہر سکوں کی مضمحل فضا میں
غموں کی یورشوں کو زیر کرکے
میں ایک بار
اپنے آپ کو فتح یاب کرلوں
کہ رفتہ رفتہ

مری سدمی مٹھیوں سے یادیں سرک رہی ہیں
فضا میں تحلیل ہو رہی ہیں
دھواں دھواں ساعتوں میں اکثر
وہ چند لمحے
ابھی تلک جگنوؤں کی صورت
دکھا کے قندیلِ رہنمائی
حیات کے تارِ بیکراں میں بھی
شوقِ منزل ابھارتے ہیں
مگر اس آگے سفر کے معنی ؟

تھکن کے لمحوں میں
دھیرے دھیرے ــــ میں واپسی کے سفر میں
گزری ہوئی فضاؤں
میں سانس لوں گا
مسل کے قدموں سے
وقت نے جن کو رکھ دیا ہے
انہیں گلابوں کی باس لوں گا



یومِ جشن

جشن کا دن ہے تو پھر جشن منا لینا ہے
پھول ہونٹوں پہ تبسم کے سجا لینا ہے
لیلیٔ مرگ سے جلنے کی ادا لینا ہے
ورقِ گل سے ہمیں رنگِ قبا لینا ہے
کوچۂ یار میں الزامِ وفا لینا ہے
کفِ محبوب سے شوخیٔ حنا لینا ہے
جشن کا دن ہے تو پھر جشن منا لینا ہے

خلشِ خارِ مغیلاں ہے کہاں سے بچیے
عشق کرنا ہے تو کیوں دشمنِ جاں سے بچیے
منزلِ شوق میں کیا جورِ بتاں سے بچیے
دشنۂ یارِ مقابل ہے کہاں سے بچیے
رسمِ دیرینہ سے اب کام منا لینا ہے
جشن کا دن ہے تو پھر جشن منا لینا ہے

آج بھی ایسے رگ و پے میں لہو باقی ہے
شوقِ عشاق پہ یہ شعلِ عدو باقی ہے
مشقِ سحر کے لیے ایسا لہو باقی ہے
یعنی ہر حال میں ربطِ من و تو باقی ہے

نقدِ جاں دے کے ہمیں عہدِ وفا لینا ہے
جشن کا دن ہے تو پھر جشن منا لینا ہے

اس ہوائیں مرے زخموں کی نہ تشہیر کریں
کیوں حدیثِ دلِ مرحوم کی تفسیر کریں
شکوۂ جورِ ستاں آج نہ تحریر کریں
گھر کے ملبے پہ ہی گھر دوسرا تعمیر کریں

زخم غیروں کی نگاہوں سے چھپا لینا ہے
جشن کا دن ہے تو پھر جشن منا لینا ہے



تیس شب گزیدہ نظمیں

(۱) شام ___ اس رات سے پہلے

شام تیر و کماں، شام نامہرباں
شام رہزن گماں، لشکرِ دشمناں
پے بہ پے چل رہی ہے سناں
کیا کرے گی یہ جاں
کوئی آسیب ___ لمحوں کی دہلیز پر
ہے کھڑا
دیکھتے دیکھتے جسمِ جاں میں در آئے گا
کیا کروں ___ کس طرح روک لوں
کھڑکیاں، روزن و در، سبھی راستے بند ہیں
اس کو آنا ہی ہے وہ مگر آئے گا
اک دھواں سارے کمرے میں بھر جائے گا
شام کا زہر شب کے بدن میں اتر جائے گا



آج بھی اپنے رگ و پے میں لہو باقی ہے
شوقِ عشاق پہ شغلِ عدو باقی ہے
مشقِ سحر کے لیے ایسا لہو باقی ہے
یعنی ہر حال میں ربطِ من و تو باقی ہے
نقدِ جاں دے کے ہمیں عہدِ وفا لینا ہے
جشن کا دن ہے تو پھر جشن منا لینا ہے

اب ہوائیں مرے زخموں کی نہ تشہیر کریں
کیوں حدیثِ دلِ مرحوم کی تفسیر کریں
شکوۂ جورِ ستم آج نہ تحریر کریں
گھر کے ملبے پہ ہی گھر دوسرا تعمیر کریں
زخم غیروں کی نگاہوں سے چھپا لینا ہے
جشن کا دن ہے تو پھر جشن منا لینا ہے



تبن شب گزیدہ نظمیں

(۱) شام ـــــ اس رات سے پہلے

شام تیرو کماں، شام نامہرباں
شام رہبر گماں، لشکرِ دشمناں
یہ سر پہ چل رہی ہے سماں
کیا کہے گی یہ جاں
کوئی آسیب ـــــ لمحوں کی دہلیز پر
ہے کھڑا
دیکھتے دیکھتے خیمۂ جاں میں در آئے گا
کیا کروں ـــــ کس طرح روک لوں
کھڑکیاں، روزن و در، سبھی راستے بند ہیں
اس کو آنا ہی ہے وہ مگر آئے گا
اک دھواں سارے کمرے میں بھر جائے گا
شام کا رہبر شب کے بدن میں اتر جائے گا



(۲) ایک نظم۔ بے خواب رات کی

یہ بھی ممکن ہے کہ کل رات بہت سویا ہوں
یہ بھی ممکن ہے دواؤں کا اثر ہو شاید
اس سے کچھ دیر تلک
جن کتابوں نے مجھے گھیرا تھا
ہو نہ ہو اس بھی گرفتار سا رکھا ہے
——— رات کچھ بھی ہو مگر
روٹھ جائے گی یونہی نیند اگر
ریزہ ریزہ کسی تاریک گپھا میں یہ رات
اور اترے گی اترتی ہی چلی جائے گی
اسی تنہائی کے اس بارِ گراں کو لے کر
میں کہاں شب کے اندھیرے میں نکل پاؤں گا
سنساتی ہوئی دہشت زدہ آوازوں سے
جسم و جاں کیسے بچا پاؤں گا
اور کچھ دیر اگر نیند نہیں آئے گی
رات کے خوف سے مر جاؤں گا



(۳) ڈوبتی رات میں ایک نظم

مجھے کیا خبر تھی
مگر جب میں رہنے لگا
ایک اک کر کے لوگوں نے مجھ سے کہا
کہ وہ آدمی
مجھ سے پہلے جو کمرے میں رہتا تھا
اک حادثہ کر گیا
زیست سے لڑ گیا
اور پھر ایک سیہ رات میں کھو گیا
زندگی کی گراں بار زنجیر سے
جس کو آزاد ہونا تھا وہ ہو گیا

صبح دم ایک غوغا ہوا
"خودکشی، خودکشی"

تمھیں آنے والے مہ و سال
کی سانسیں بھی
جو سرگوشیوں میں چھپی ہیں
کہو تو بتا دوں،
مگر تم یقیں بھی کروگے؟؟



دوسری آہٹیں

[رافعہ رماس کی رہائی ایک نظم]

ابھی تک
آنگن میں اس کی یادوں کے دل نشیں پھول کھل رہے ہیں
ابھی تک
کمرے میں اس کی خوشبو مشامِ جاں میں مہک رہی ہے
ابھی ہوائیں چہک رہی ہیں
ابھی فضائیں وہی صدا جگنوؤں کی صورت
چمک رہی ہے،
ابھی اُبھی گرم گرم سانسوں سے
سد کمرہ مہک رہا ہے
ابھی وہی لمسِ بے نہایت مجھے منور کر گیا ہے
ابھی مجھے یاد آ رہی ہے

مگر یہ دستک ۔
کوئی مجھے پھر جگا رہا ہے
مگر ابھی میں خمار میں ہوں
ابھی مجھے نیند آ رہی ہے
میں اس کی یادوں میں کھو گئی ہوں
کوئی بھی اس کے سوا نہ آئے
ابھی کوئی دوسرا نہ آئے



مرا بدن مجھ سے پوچھتا ہے

[رافعہ رباب کی زبانی دوسری نظم]

قصور ایسا ہے
اس کو مجرم قرار کیوں دوں
قصور ایسا ہے
وہ تو خود لہر لہر بن کر
مرے بدن کے لپکتے ساحل پہ آ رہا تھا
وہ میری جلتی زمیں کو
لمس مہرباں دینے والا تھا
اور میں سمجھ رہی تھی
کہ جسم کا بوجھ آ گیا تو
وہ روح کے شہر جاں تلک نہ جا سکے گا
میں مطمئن تھی، یہ سوچتی تھی

وہ قریۂ جاں کی شہریاری سے خوش ہوا ہے
وہ میرے اندر کا حکمراں ہے
وہ مالکِ روح و جاں بنا ہے
اسے بدن کی کثافتوں میں کہاں سمیٹوں
اسے تقدس کے مسروں پر سجا کے رکھوں
—— مگر مرا جسم پوچھتا ہے
کہ آخرش میری کیا خطا ہے
مجھے یہ کس جرم کی سزا ہے
وہ شخص جو تجھ کو چاہتا ہے
وہ شخص یوں مجھ سے کیوں خفا ہے
—— کہ جب وہ آئے
بدن کا ہر انگ اس کی آمد
کے گیت گائے
مری نظریں بکھر سا آئے
مرے رگیسو کھُلے کھُلے سے
اسی کے رُخ پر نثار ہونے کے منتظر ہوں
مرے لبوں کو کسی مہک ریز لمس
کا گماں ہو
ہر ایک عضو چاہتا ہے
وہ مہرباں ہو، وہ مہرباں ہو
مگر وہ پتھر کا بُت بنا ہے

اسے کہوں کیا

قصور ایسا ہے
اس کو مجرم قرار دوں کیا
میں روح کی سرخوشی کی خاطر
بدن کو ایسے
عذابِ مسلسل و سہار دوں کیا ؟



مصنّف کی دیگر تصانیف:

- سفر جلتے دنوں کا (شعری مجموعہ)
- احتساب (تنقیدی مضامین)
- اعتبار (تنقیدی مضامین)